(غلام گردش)

چار آنے کا کھلاڑی

پشاور کی بے حد سخت موسم والی شام تھی۔ انتہا کی گرمی۔ رائل ایئر فورس کی چھاؤنی میں تھوڑی سی رونق تھی۔ انگریز افسر اور انکے بیوی بچے، چھاؤنی کی مارکیٹ کی جانب سائیکلوں پر آ جا رہے تھے۔ شام کا پچھلا پہر تھا۔ سورج ابھی ڈوبا نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ہوا، زندگی کے لمس میں خوشگوار تاثر قائم کر رہی تھی۔ یہ 1922 کا پشاور تھا۔ تقسیم برصغیر سے بہت پہلے کا وقت۔

کلب کی رونق آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ اسکے بالکل ساتھ سکواش کورٹ تھا۔ اوپر سے کھلا یہ کورٹ اس بے انتہا سخت گیم کیلئے کافی تھا۔ ایئر فورس کے دو گورے افسر، سکواش کھیلنے میں مصروف تھے۔ اچانک ایک افسر سے غلط زاویے پر شاٹ لگی۔ گیند قیامت کی تیزی سے احاطہ سے باہر چلی گئی۔ بلکہ گم ہوگئی۔ دونوں باہر نکل کر بال ڈھونڈنے لگے۔ لمبی گھاس میں اتنی چھوٹی گیند تلاش کرنا قدرے مشکل تھا۔ دونوں کی نظر ایک بچے پر پڑی۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے، ننگے پاؤں، یہ بچہ کواٹروں سے کھیلنے کیلئے آیا تھا۔ انگریز افسر نے زور سے آواز دی۔ بچہ بھاگتا ہوا آیا۔ گیند گم گئی ہے۔ تلاش کر کے لاؤ۔ گورے بادشاہ کا حکم تھا۔ کسی بھی مقامی شخص کی کیا مجال تھی کہ حکم عدولی کرے۔ بچہ تیزی سے گھاس میں بال تلاش کرنے لگا۔ بالکل ایسے ہی، جیسے ایک عقاب اپنا شکار ڈھونڈتا ہے۔ چند منٹوں میں بچے کو گوہر مقصود مل گیا۔ بال لیکر دوڑتا ہوا گورے افسر کی طرف گیا۔ امانت انکے حوالے کر کے واپس جانے لگا۔ تو انگریز افسر نے اپنے ساتھی سے کچھ پوچھ کر زور سے واپس آنے کو کہا۔ حکم دیا، کہ کھیلتے ہوئے ہماری گیند اکثر گھاس میں گم ہو جاتی ہے۔ تم ایسے کر و روز، میس میں آ جایا کرو۔ جیسے ہی گیند گھاس میں گے، تو دوڑ کر واپس لے آنا۔ تمہیں اس کام کے چار آنے روزانہ دیا کرینگے۔ بچہ بے حد خوش ہوگیا۔ سلسلہ یہ ہوا کہ جیسے ہی صاحب لوگوں کی گیند کورٹ سے باہر آتی۔ لڑکا، اسے پکڑ کر فوراً واپس لے آتا۔ آہستہ آہستہ انگریز افسروں نے اس پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ سکواش کے ریکٹ اور بال، اسکے پاس رکھوا دیے۔ مقرر وقت پر بچہ ریکٹ اور بال، کورٹ میں لے آتا۔ افسر گیم کھیلتے اور دوبارہ اسی کے پاس رکھوا دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ سلسلہ بڑھ گیا۔ تمام کھلاڑی اپنا سامان بچے کے پاس رکھوانا شروع ہوگئے۔ ایک طرح سے سکواش کورٹ میں ملازم ہوگیا۔ بچہ صرف نو برس کا تھا۔ لڑکپن کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ دو تین سال بڑے انہماک سے گیم کو دیکھتا رہا۔ ایک دن ذہن میں ٹھانی کہ اب خود کھیلے گا۔ افسروں سے کھیلنے کی اجازت لے لی۔ جیسے ہی تمام انگریز گیم ختم کر کے واپس چلے جاتے۔ تو وہ بچہ، بڑی محنت سے ننگے پیر، سکواش کھیلنا شروع کر دیتا۔ گھنٹوں کھیلتا رہتا۔ اسکے ساتھ ساتھ اس نے ورزش کرنی شروع کر دی۔ اب یہ ہوا، کہ جھاڑو سے سکواش کورٹ کی صفائی کرتا تھا۔ شام کو صاحب لوگوں کو گیم کرواتا تھا۔ دن میں دوبار خود بھی کھیلتا تھا۔ انگریز افسر اسکی بے حد حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہ بچہ، دراصل سکواش کی دنیا کا بے تاج بادشاہ، ہاشم خان تھا۔

ہاشم، اس کھیل پر اتنا حاوی ہوگیا کہ پہلے انڈیا اور پھر تقسیم کے بعد پاکستان کا چمپئن بن گیا۔ 1951 میں اسے پاکستان ایئر فورس نے لندن کے بین الاقوامی مقابلے میں بھجوایا۔ کھیل میں پہلی بار اس نے جوتے پہنے۔ اس سے پہلے، وہ تمام عمر برہنہ پیروں سے کھیلتا رہا تھا۔ بڑی آسانی سے بین الاقوامی چمپئن بن گیا۔ مسلسل سات برس، ہاشم خان، دنیا پر اپنے کھیل کی بدولت حکومت

کرتا رہا۔1958 تک اسے سکواش میں کوئی بھی شکست نہ دے سکا۔اس خاندان سے سکواش جیسی مشکل گیم کے متعدد بین الاقوامی کھلاڑی پیدا ہوئے۔اگر آپ 1947 سے لیکر ملک کے پہلے پتیس چالیس برس دیکھیے۔تو پاکستان نے متعدد کھیلوں میں سنہرا نام پیدا کیا تھا۔ہاکی کو لے لیجئے۔صلاح الدین،شہناز شیخ،اختر رسول،حسن سردار،سمیع اللہ جیسے عظیم کھلاڑی،بین الاقوامی سطح پر ہمارے ملک کی پہچان بن گئے۔ایک زمانے میں ہاکی میں پاکستان کو ہرانا ناممکن تھا۔بالکل اسی طرح،کرکٹ ہمارے ملک کی شناخت بن تھی۔بھلے زمانے میں کرکٹ میں فضل محمود،ماجد خان،ظہیر عباس،میاں داد اور عمران خان جیسے بہترین کرکٹر موجود تھے۔ساری کھیلوں کا ذکر نہیں کرسکتا کیونکہ ایک کالم میں اتنا سب کچھ سمیٹا نہیں جاسکتا۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک زمانے میں پاکستان ہر سطح پر کھیلوں کے میدان میں قابل رشک حیثیت کا مالک تھا۔پر سوچنے کی بات ہے،کہ اس سنہرے دور کے بعد،اس درجہ انحطاط کیسے اور کیونکر وقوع پذیر ہوا۔موجودہ حالت تو یہ ہے کہ ہمارا ملک اولمپک تو چھوڑیئے،کسی بھی انٹرنیشنل مقابے میں بے حد نمایاں حیثیت کا مالک نہیں ہے۔تنزلی کا یہ سفر اتنا مہیب ہے کہ سوچنے والا شخص پریشان ہوجاتا ہے۔ایسی بلندی،اور اب ایسی پستی۔

پہلی تکلیف دہ بات تو یہ کہ پورے ملک میں کھیلوں کے حوالے سے کوئی دوررس قومی پالیسی موجود نہیں ہے۔پلاننگ کے بغیر،ہمارا تمام کام،ایڈہاک طریقے سے کیا جاتا ہے۔ملکی یا انٹرنیشنل سطح کا کوئی مقابلہ ہونے کے قریب ہوا۔تو ہم ایک دم جاگ جاتے ہیں۔خراٹے مارتی ہوئی نیند سے تھوڑی دیر کیلیئے باہر آتے ہیں۔کیمپ لگایا جاتا ہے۔جس میں کھلاڑیوں کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔یہ تربیت،فنی طریقے سے اس قدر ناقص ہوتی ہے،کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔چند دوستوں کے ساتھ،ایک تربیتی کیمپ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ملکی سطح کے ایک ادارے کے سپورٹس ہوسٹل میں تمام کھلاڑیوں کیلیئے مناسب بیڈ تک نہیں تھے۔پچاس فیصد کھلاڑی،ٹریننگ کے بعد رات کو زمین پر سوتے تھے۔انکے لیے انتہائی بوسیدہ فوم کے گدے موجود تھے۔کھانے کا انتظام حد درجہ ناقص تھا۔کھلاڑی کھانا باہر سے کھاتے تھے۔پوری ٹیم کیلیئے کوئی ڈائٹیشن نہیں تھا۔کوئی تھیراپسٹ نہیں تھا۔سارا کام،صرف اور صرف اللہ توکل چل رہا تھا۔یہ ایک ساکھ والے ملکی ادارے کا تربیتی کیمپ تھا۔باتھ روم اتنے غلیظ تھے کہ انسان وہاں ایک منٹ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔تمام قومی اداروں میں،کھیلوں کے حوالے سے بالکل ایک جیسی زبوں حالی ہے۔قومی سطح پر ہمارے پاس،کوئی ایسی مربوط پالیسی ہی نہیں ہے،جسکی بدولت مختلف کھیلوں پر بین الاقوامی معیار کے مطابق توجہ دی جاسکے۔مربوط قومی پالیسی کے بغیر،اس اہم ترین شعبے کو اوپر اُٹھانا ناممکن ہے۔

دوسری بات بھی انتہائی اہم ہے۔ہمارے پاس جدید ترین سطح کا انفراسٹکچر موجود نہیں ہے۔کھیلوں کے اعتبار سے متعدد سٹیڈیم بنائے گئے۔مگر وہاں،اعلیٰ درجے کی سہولتیں مکمل طور پر ناپید ہیں۔ہاں،اگر ہم نے چند اچھے سٹیڈیم بنا بھی دیے ہیں۔تو ان سہولتوں کو استعمال کرنے کا فنی شعور ناپید ہے۔صرف چار دیواری اور سیڑھیاں بنانے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔اصل بات تو ان گراؤنڈوں کا جدید ترین زاویوں سے سائنسی استعمال ہے جس سے کھلاڑی تربیت پاکر آگے نکلے۔اگر کھیلوں کے حوالے سے جدید سائنسی سوچ ہی نہیں۔تو صرف گراؤنڈوں سے تو گھاس کی طرح کوئی اچھا کھلاڑی نہیں اُگ سکتا۔کھلاڑیوں کی تربیت تو اب ایک مکمل طور پر سائنس ہے۔ہر طرف غور سے دیکھیے۔اگر،انفراسٹکچر کا جدید طریقے سے استعمال ہوتا نظر میں آئے،تو خاکسار کو ضرور بتایئے گا۔

تیسرے نکتہ پر بھی غور کرنا چاہیے۔کھلاڑیوں کی نرسریاں موجود نہیں ہیں۔یعنی پورے ملک میں کوئی ایسا نظام نہیں ہے۔جس میں بچوں کی سطح سے ٹیلنٹ کو تلاش کیا جائے اور اسکے بعد ان پر محنت کی جائے۔کسی بھی سپورٹس کی طرف توجہ دیجئے۔ہمارے ملک میں نوعمری کی سطح پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔اگر ایک بچہ،اچھا ایتھلیٹ بننے کا قدرتی ہنر رکھتا ہے تو اسے شناخت کر کے آگے کیسے لایا جائے۔کسی کھلاڑی سے پوچھ لیجئے۔ننانوے فیصد لوگ،اپنی ذاتی محنت کے بل بوتے پر آگے نکلتے ہیں۔یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سکولوں سے کسی بھی کھیل کا جوہر تلاش نہ کیا جائے۔پھر قوم اُمید کرے بلکہ دعائیں مانگے کہ مقابلے میں ٹیم سرفراز ہو جائے۔یہ بذات خود ناممکن کام ہے۔قدرت کے قوانین کے بھی خلاف ہے۔پوری دنیا میں چھوٹی عمر کے بچوں اور بچیوں کیلئے باقاعدہ ادارے موجود ہیں۔انتہائی بلند سطح کے ماہرین انتہائی ریاضت سے سکول جا کر ٹیلنٹ کو شناخت کرتے ہیں۔پھر ان کی تربیت کیلئے نرسریاں قائم ہیں۔سات آٹھ سال کی عمر سے ہی،قومی اداروں سے تعلق رکھنے والے سپورٹس ماہرین،محنت شروع کروا دیتے ہیں۔دس بارہ برس کی تربیت سے،بین الاقوامی سطح کے کھلاڑی پیدا ہوتے ہیں۔جنکو کسی بھی مقابلے میں مات دینا ناممکن ہے۔خود سوچیے۔کیا،ان نرسریوں کے بغیر،کسی بھی ملک میں اچھے کھلاڑی سامنے لائے جاسکتے ہیں۔قطعاً نہیں،بلکہ ہرگز نہیں۔

ہاں،ایک اور تکلیف دہ حقیقت۔ہم نے کرکٹ کو پیسہ کمانے کی مشین بنا دیا ہے۔اس میں حد درجہ معاوضہ بھی ہے اور مراعات بھی۔یہ کوئی غلط بات نہیں۔مگر یہ سب کچھ،باقی تمام کھیلوں کی بربادی کے عوض کیا جا رہا ہے۔یعنی اب اگر کھلاڑی کے پاس پیسہ ہے تو صرف کرکٹ میں۔باقی تمام کھیلوں کے ہیرو،تقریباً گمنامی اور سفید پوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔کئی تو اپنے میڈل بازار میں فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔حکومتی بے اعتنائی اور مالی مشکلات میں انکا کوئی سہارا نہیں بنتا۔اکثر اخبار میں تصویر آتی ہے کہ ایک بوڑھا کھلاڑی،بازار میں اپنے میڈل سامنے رکھ کر مالی امداد کیلئے صدا دے رہا ہوتا ہے۔ہمارے عجیب معاشرے میں کسی کے پاس اتنا وقت ہے کہ کھیلوں کی بہتری کیلئے توجہ دے۔کھلاڑیوں کو بے روزگاری کے عذاب سے باہر نکالے۔ہمارے موجودہ نظام سے تو 1920 کے وہ انگریز افسر بہتر تھے جنہوں نے ہاشم خان کو سکواش کورٹ استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی۔جو اسے روز چار آنے دیتے تھے،تاکہ وہ توجہ سے کھیل کی طرف دھیان دے۔سکواش کو آگے لیکر جائے۔اب تو واقعی،اکثر کھلاڑیوں کو کوئی چار آنے دینے کیلئے بھی تیار نہیں۔اچھے کھلاڑی اس طرح کیا خاک پیدا ہونگے!

راؤ منظر حیات